قانونِ اسلامی کی تدوین

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

جو لوگ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے مخالف ہیں وہ اس کے خلاف جہاں اور اعتراضات اٹھاتے ہیں، وہاں ایک اعتراض یہ بھی اٹھاتے ہیں کہ اسلامی قانون مروجہ ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی کی طرح مدون صورت میں موجود نہیں ہے بلکہ نہایت منتشر اور غیر مرتب حالت میں ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے احکام بے شبہ موجود ہیں لیکن ان کی توجیہ و تاویل میں بے شمار اختلافات ہیں۔ احادیث میں قوانین کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن ایک طرف تو ان میں تاویل و توجیہ کے اختلافات ہیں، دوسری طرف ان کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرنا ایک بہت بڑا معرکہ ہے۔ قانون اسلامی کا سب سے بڑا سرمایہ فقہ اسلامی کی شکلوں میں ہے۔ لیکن یہ سب سے زیادہ منتشر حالت میں ہے۔ اول تو ہمارے ہاں مختلف فرقے ہیں، اور ان کی الگ الگ فقہیں ہیں۔ کوئی ایک ہی فقہ نہیں ہے کہ اس کو اختیار کر لیا جائے اور مسئلہ طے ہو جائے۔ بلکہ متعدد فقہیں ہیں جن میں سے کسی ایک فقہ کو بھی اختیار کرنا دوسری فقہوں کے حامیوں سے لڑائی مول لینا ہے۔ ثانیاً ان میں سے کوئی فقہ بھی ایک ضابطۂ قانون کی صورت میں مدون نہیں ہے کہ اس کو اختیار کر کے ملک میں نافذ کیا جا سکے اور عدالتیں اس کے مطابق معاملات کے فیصلے کر سکیں۔ ہر فقہ کے اندر بے شمار اختلافات ہیں جن کے سبب سے اس کا ایک ضابطۂ قانونی کی شکل قبول کرنا نہایت دشوار امر ہے۔ مثال کے طور پر فقہ حنفی کو لیجئے۔ یہ باوجودیکہ مدتوں ایک وسیع اسلامی دنیا میں جاری و نافذ رہ کر بہت بڑی حد تک منجھ بھی چکی ہے تاہم دیکھئے اس میں کتنے اہم اختلافات ہیں۔ اس میں کتنے مسائل ہیں جن میں خود امام صاحبؒ کے فتوے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کتنے مسائل ہیں جن میں فقہ حنفی کے دوسرے اساطین مثلاً قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اپنے امام سے مختلف مذہب رکھتے ہیں۔ کتنے مسائل ہیں جن میں متاخرین کے فتوے متقدمین کے فتووں سے الگ ہیں۔ اسی طرح کے

گوناگوں اختلافات ہیں جو ایک ہی فقہ کے اندر پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہماری مختلف فقہوں میں سے کسی فقہ کو بھی ملک کے لئے ایک ضابطہ قانون کی حیثیت سے اپنایا جاسکے۔

معترضین اس اختلاف و انتشار کو ثبوت میں پیش کر کے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر آج کی عدالتوں کو درآنحالیکہ کوئی مدوّن ضابطہ قانون اسلامی کا موجود نہیں ہے براہِ راست کتاب و سنت سے اجتہاد کرنے کا وہ اختیار دے دیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریحؒ کو دیا تھا تو لازمی طور پر اس کے دو نتیجے سامنے آئیں گے۔ ایک تو یہ کہ عدالتیں بالکل من مانے فیصلے کریں گی جن کو کتاب و سنت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہیں گی۔ تو اپنے زورِ اجتہاد سے یا اسلامی فقہ کے وسیع ذخیرہ میں سے کوئی نہ کوئی بات اپنے مطلب کی ڈھونڈھ ہی نکالیں گی۔ دوسرا یہ کہ جج اور قاضی اگر دیانت داری برتنا چاہیں گے، ایک سخت حیرانی و پریشانی سے سابقہ پڑے گا۔ کیونکہ ہر معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت ان کو کسی مدوّن ضابطہ کے بجائے ایک منتشر ذخیرۂ معلومات سے رہنمائی حاصل کرنی پڑے گی۔ اور یہ کام نہ صرف یہ کہ نہایت مشکل ہے بلکہ اس طرح سے عدالتی نظام کا ہموار اور یکسانی کے ساتھ کام کرنا تقریباً محال ہے۔

اسلامی قانون کے مدوّن صورت میں موجود نہ ہونے کی بنا پر تو معترضین مذکورہ بالا اعتراض اٹھاتے ہیں لیکن اگر اس کو مدوّن کرنے کی تحریک کی جائے۔ تو مختلف مذہبی اور غیر مذہبی جماعتیں اس پر بھی طرح طرح کے شبہات وارد کرتی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان شبہات کا بھی ہم یہاں مختصراً تذکرہ کر دیں، تاکہ معاملہ کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے۔

یہ گروہ مندرجہ ذیل شبہات پیش کرتا ہے:۔

تدوین قانون اسلامی پر بعض شبہات

پہلا شبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں جو وسعت ہے وہ اس ضابطہ بندی اور تدوین سے بالکل سکڑ کر رہ جائے گی عدالتیں پابند ہو جائیں گی کہ وہ ہر معاملہ کا فیصلہ اس ضابطہ کی روشنی میں کریں جو ان کے سامنے بنا کر رکھ دیا گیا ہے خواہ انصاف اور شریعتِ الٰہی کا منشا پورا ہو یا نہ ہو۔ ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اسلام کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ججوں کو کتاب و سنت کے سوا

کسی اور شے کا پابند کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن بھیجا تو فیصلہ معاملات کے سلسلہ میں کتاب و سنت کی پابندی کے ماسوا کسی اور چیز کی پابندی ان پر عائد نہیں فرمائی۔ پھر کسی اور کو کیا حق حاصل ہے کہ اسلامی عدالتوں کے ججوں اور قاضیوں کو شریعت نے جو آزادی دے رکھی ہے اس کو سلب یا محدود کرے؟ اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ جس حق کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کے اندر محصور کیا تھا وہ اس ضابطہ کے اندر محفوظ بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک امر کا فیصلہ اگر براہ راست کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جاتا تو کچھ اور ہوتا اور اگر اس ضابطہ کی روشنی میں کیا جائے تو اس سے بالکل ہی مختلف ہو۔ پھر یہ کتاب و سنت سے انحراف ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

دوسرا شبہ یہ ہے کہ تدوین قانون کا کام لازماً چند افراد پر مشتمل کوئی کمیٹی کرے گی۔ یہی کمیٹی اپنے اجتہاد سے اسلامی فقہ کے وسیع ذخیرہ میں سے انتخاب کر کے اسلامی قانون کی تدوین کرے گی۔ اور پھر یہی مدون ضابطہ ملک کا قانون بنے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی کسی محدود کمیٹی کا مرتب کردہ ضابطہ اسلامی شریعت کا قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور صرف چند نفوس کا اجتہاد ایک پورے ملک کے مسلمانوں پر مسلط کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسلامی شریعت میں اس کے جواز کے لئے کوئی گنجائش موجود ہے؟

تیسرا شبہ یہ ہے کہ جس ملک کے اندر مختلف فقہی مذاہب کے پیرو بستے ہوں، وہ اس قسم کے کسی ضابطہ پر کس طرح مطمئن ہوں گے؟ وہ اس بات پر تو مطمئن ہو سکتے ہیں کہ اس ملک کی عدالتیں معاملات کے فیصلے کتاب و سنت کی روشنی میں کریں۔ کیونکہ کتاب و سنت ان سب کے درمیان مشترک ہے لیکن ان کے لئے کسی خاص ضابطہ قانون پر مطمئن ہونا نہایت مشکل ہے۔ اس صورت میں وہ بجا طور پر یہ شبہ کر سکتے ہیں کہ ان کے اوپر کوئی ایسی فقہ لد جائے گی جس کے کچھ حصہ یا بڑے حصہ کو وہ سرے سے صحیح ہی تسلیم نہ کرتے ہوں۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کو مدون کرنے کی مثال نہ تو صدر اول میں ملتی ہے اور نہ بعد کے ادوار میں ہی اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ پھر ایک ایسی بدعت کا ارتکاب کیوں کیا جائے۔ جس کے

جواز کی دلیل فراہم کرنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے؟

یہ مختلف قسم کے اعتراضات و شبہات ہیں جو قانون اسلامی کے مخالفین کی طرف سے بھی پیش کئے جا رہے ہیں اور اس کے موافقین کی طرف سے بھی سامنے لائے جا رہے ہیں۔ مخالفین کا منشا تو ان اعتراضات سے یہ ہے کہ وہ سرے سے اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش ہی کو ناکام بنا دینا چاہتے ہیں۔ موافقین یہ تو نہیں چاہتے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں روڑے اٹکائیں لیکن قانون اسلامی کی تدوین پر ان کو جو اعتراضات ہیں وہ بجائے خود ایسے ہیں کہ بہتوں کے ذہن میں ان سے الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان سے اسلامی قانون کے مخالفین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے ہم ان تمام شبہات کو یہاں تفصیل کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلے اعتراض کا جواب | جو لوگ اسلامی قانون کے مدوّن صورت میں موجود نہ ہونے کے سبب سے اس کے نفاذ ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں اور اس بنا پر موجودہ غیر اسلامی ضابطوں ہی کے جاری رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ مدوّن اور غیر مدوّن قانون کے فرق سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس ناواقفیت کے سبب سے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر ایک قوم کے پاس اس کا قانون مدوّن شکل میں موجود نہیں ہے تو اس کے لئے اپنے تصورِ قانون کے مطابق اپنے نظامِ عدالت کو چلانا ہی ناممکن ہے۔ اور جب ان کے نزدیک یہ ناممکن ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے خیال میں پھر واحد چارۂ کار ایسی قوم کے لئے یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جس قانون کو بھی اختیار کئے ہوئے ہے اسی کو چپ چاپ اختیار کئے ہوئے رہے کیونکہ کسی نہ کسی قانون کا موجود ہونا لاقانونیت کی زندگی سے بہرحال بہتر ہے۔ اگرچہ وہ قانون خدا کے بجائے شیطان ہی کا بنایا ہوا ہو۔

ان معترضین کو شاید پتہ نہیں ہے کہ مدوّن قوانین کا رواج دنیا میں کب سے ہوا ہے۔ یہ غریب سمجھتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ اپنے عدالتی نظام کو مدوّن قوانین ہی کی مدد سے چلاتی رہی ہے۔ اگر عدالتوں کے لئے مرتب احکام و قوانین کے ضابطے نہ ہوں تو پھر نہ تو عدالتیں کوئی کام کر سکتی ہیں اور نہ عدل و انصاف قائم رکھنے کیلئے کوئی ممکن صورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ خیال محض حقیقتِ حال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں جو قومیں

قانون کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں اور جو ایک مدت سے ایک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کر چکے ہیں بہت عرصے تک کسی مدون قانون سے بالکل ناآشنا ہے۔ ان کی عدالتیں صرف عرف و رواج پر معاملات کے فیصلے کرتی رہیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے تک یورپ مدون قوانین سے تقریباً ناآشنا رہا۔ سب سے پہلا شخص نپولین ہے جس نے تدوین قانون کی طرف توجہ کی اور اس نے ۱۸۰۴ء میں مشہور "قانون نپولین" کا نفاذ کیا جس کو یورپ میں تدوین قانون کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں نپولین ہی کے مدون کرائے ہوئے ضابطہ کو تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ اپنا لیا گیا۔ اور اس آخری دور میں آکر یعنی ۱۹۲۶ء میں ترکوں نے جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے اس قانون کو اپنایا۔

اس سے زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے دو بڑے ملک جو آج تہذیب جدید کے امام سمجھے جاتے ہیں، یعنی انگلستان اور امریکہ، وہ انیسویں صدی کی اس تحریک تدوین سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے بلکہ بدستور اپنے اسی عرف و رواج والے طریقہ پر قائم ہیں جو ان کے ہاں قدیم سے جاری ہے۔ اسی کے مطابق ان کی عدالتیں سارے معاملات کے فیصلے کر رہی ہیں اور ان کا کام بے روک ٹوک جاری ہے۔ ان کے سامنے کوئی مدون ضابطہ قانون نہیں ہے۔

کیا اس صورتِ حال کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان اور امریکہ کی عدالتیں بالکل من مانے فیصلے صادر کرتی ہیں اور ججوں کی خواہشات کے سوا وہاں کوئی اصولِ انصاف نہیں ہے؟ یا ان ملکوں کی عدالتوں کے فیصلوں میں ہم رنگی اور یکسانی کے بجائے انتشار ہے؟ یا ان ملکوں کی عدالتیں جو فیصلے کرتی ہیں وہ ان قانونی تصورات کے مطابق نہیں ہوتے جو ان ملکوں میں پائے جاتے ہیں؟ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے تو وہ ان ملکوں کی عدالتوں کے طریقِ کار اور ان کے طریقِ عدل و انصاف سے بالکل ناواقف ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان ملکوں میں اس طرح کے مدون قانونی ضابطے نہیں ہیں جس طرح کے مدون ضابطے یورپ کے دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز نہیں ہیں

کہ ان ملکوں کی عدالتوں کو من مانے فیصلے کرنے کے لئے بالکل چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ جس طرح دوسرے ملکوں کی عدالتیں اپنے مدوّن ضابطوں کی پابندی کرتی ہیں اسی طرح امریکہ اور انگلستان کی عدالتیں اپنے پچھلے فیصلوں اور نظائر (Precedent) کی پابندی کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی عدالتوں کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے سے بالاتر عدالتوں کے فیصلوں اور نظائر کی پابند رہیں۔ اور بالائی عدالتوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے سابق فیصلوں اور نظائر کی پابندی کریں۔ اس طرح کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں اور امریکنوں کے پاس کوئی مدوّن قانون نہیں ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ان کے ہاں عدالتی نظائر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان نظائر نے رسمی طور پر نہ سہی لیکن فی الحقیقت اُن کے قانون کو مدوّن کر دیا ہے۔ ان کی موجودگی میں فیصلہ کی راہ متعین ہے۔ اور عدالتوں کے لیے ان کے دائرہ سے باہر نکل کر کوئی من مانا اجتہاد کر ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہ گیا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کے رسم و رواج کا بڑا حصہ عدالتی فیصلوں کی راہ سے نظائر کی حیثیت اور پھر اس راستہ سے ملک کے قانون کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

اگر انگلستان اور امریکہ میں یہ صورت چل سکتی ہے اور آج تک چل رہی ہے تو اسلامی قانون محض اس بنا پر کہ وہ مدوّن صورت میں موجود نہیں ہے کیوں نہیں چل سکتا؟ اور اگر اس کو اختیار کیا جائے تو عدالتیں من مانے فیصلے کرنے کے لیے کیوں آزاد ہو جائیں گی؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلامی قانون کے چند اصول بالکل قطعی ہیں جن کی خلاف ورزی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے مثلاً یہ کہ کوئی فیصلہ کتاب و سنت کے نصوص کے خلاف نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی فیصلہ اجماع کے خلاف نہیں کیا جاسکتا اسی طرح یہ بات بھی امت میں مسلّم ہے کہ کوئی اجتہاد ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کے خلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان اصولوں کی پوری پابندی کی جائے اور اتباع کتاب و سنت اور اتباع شریعت کا وہ جذبہ ججوں کے اندر موجود ہو جو اسلامی عدالتوں کے ججوں میں ہونا چاہیئے اور ان کے اندر شریعت کا وہ علم بھی موجود ہو جو اسلامی قضا کے فرائض کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے تو محض اس وجہ سے کہ اسلامی قانون مدوّن صورت میں موجود نہیں ہے کیوں ہماری عدالتیں ہمارے اسلامی تصورِ قانون کے مطابق ہمارے

عدالتیں کے فیصلے نہیں کر سکیں گی؟ اور کیوں یہ اندیشہ کیا جائے کہ ان کے فیصلے بالکل من مانے ہونے لگیں گے؟ اگر محض عرف و رواج کو اساس اور نظائر کو رہنما بنا کر انگلستان اور امریکہ کی عدالتوں کو مطلق العنانی سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ تو اس سے بدرجہا اقرب یہ بات ہے کہ کتاب و سنت کے نصوص، آئمہ مجتہدین کے اجتہادات اور ان کے مسلّمہ اصول اجتہاد کا پابند بنا کر اسلامی عدالتوں کو ہر قسم کی مطلق العنانی سے محفوظ کیا جا سکے۔ اور بغیر کسی مدوّن قانون کی موجودگی کے ملک کے نظام عدالت کو اسلامی تصوّر کے مطابق چلایا جا سکے۔ اگر اس میں تھوڑی بہت خرابیاں پیدا ہوں گی تو یہ اسی طرح کی خرابیاں ہوں گی جن سے کوئی نظام بھی پاک نہیں رکھا جا سکتا۔ قاضی شریحؒ کو حضرت عمرؓ نے جو ہدایات دی تھیں ان میں جہاں ان کو کتاب و سنت اور اجتہاد سے رہنمائی حاصل کرنے کی ہدایات فرمائی تھیں وہاں ان کو یہ تاکید بھی کی تھی کہ جس چیز کے بارہ میں اگلوں کا اجتہاد موجود ہو اس میں کسی نئے اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہی پابندیاں آج بھی ملحوظ رکھی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلامی شریعت پر ایمان رکھنے والے قاضی اور جج محض اس وجہ سے شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے نہ کر سکیں کہ ان کے سامنے کوئی مدوّن ضابطہ موجود نہیں ہے جو ان کو حدود شرع کے اندر محدود رکھ سکے۔

یہ ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو اسلامی قانون کے مدوّن شکل میں موجود نہ ہونے کے سبب سے ملک کے اندر اس کے اجراء و نفاذ ہی کو سرے سے ناممکن سمجھتے ہیں۔ اب ہم ان لوگوں کے شبہات سے بحث کریں گے جو سرے سے قانون کی تدوین ہی کو ایک غیر اسلامی فعل سمجھتے ہیں۔

تدوینِ قانون کے مخالفین کے شبہات کا ازالہ

جو لوگ سرے سے قانونِ اسلامی کی تدوین ہی کے مخالف ہیں ان کا سب سے بڑا شبہ یہ ہے کہ اس طرح اسلامی قانون کی وسعت جو ایک بہت بڑی برکت ہے، ایک معیّن ضابطہ کے اندر تنگ اور محدود ہو کر رہ جائے گی اور عدالتیں مجبور ہوں گی کہ معاملات کے فیصلے اسی معیّن ضابطے کی روشنی میں کریں اگرچہ حق ان کو اس ضابطے سے باہر نظر آ رہا ہو۔

یہ شبہ فی الواقع اپنی جگہ پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں لامحالہ عدالتوں کو ایک معیّن ڈگر کی پابندی کرنی پڑے گی اور ہماری عدالتوں کو فیصلہ اور اجتہاد کی وہ آزادی حاصل نہیں رہے گی جو حضرت معاذ بن جبلؓ

اور قاضی شریحؒ کی عدالتوں کو حاصل تھی لیکن جہاں اس میں یہ ایک پہلو طبیعت میں خلش پیدا کرنے والا ہے۔ وہاں اس میں بعض دوسرے پہلو اطمینان پیدا کرنے والے بھی ہیں اور چونکہ اطمینان پیدا کرنے والے پہلو خلش پیدا کرنے والے پہلوؤں کے مقابل میں زیادہ ہیں اس لئے اتباعِ شریعت اور پیرویٔ حق کے نقطۂ نظر سے اسی کو اختیار کرنا بہتر ہے۔

سب سے پہلے تو اس بات کو مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ شریعتِ اسلامی کی وسعت، اگرچہ خیر و برکت ہے۔ اور اس پہلو سے خیر و برکت ہے کہ اس میں رضائے الٰہی کی تلاش کے لئے ایک وسیع میدان ملتا ہے اور امت کے اختلافات کے اندر سے ایک شخص کے لئے سہل اور اقرب الی الصواب راہ متعین کر لینا نسبتہً آسان ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ کام بظاہر جتنا سہل نظر آتا ہے اتنا سہل نہیں ہے۔ اس کا خیر و برکت ہونا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے ایک یہ کہ آدمی کا علم وسیع ہو اور اس کا مزاج شریعتِ اسلامی سے ایسی گہری مناسبت رکھنے والا ہو کہ وہ اس وسعت اور کثرتِ آراء و اقوال کے اندر کھو کر نہ رہ جائے بلکہ حق و صواب کے پہلو کو متعین کر سکے۔ دوسری یہ کہ اس کا اخلاقی ضمیر اتنا بلند ہو کہ حق کے سوا کوئی دوسری چیز اس کو اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔ اگر یہ دونوں باتیں موجود نہ ہوں تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ یہ وسعت سہولت کے بجائے اس کے لیے حیرانی و پریشانی کا باعث بن جائے اور یہ اختلافِ اقوال و آراء تلاشِ حق کے بجائے پیرویٔ باطل کے لیے ایک آڑ کا کام دینے لگے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ ایک صالح معاشرہ اور ایک صحیح نظامِ تعلیم آج بھی بہتر سے بہتر آدمی تیار کر سکتا ہے لیکن بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد کی خوبیوں اور برکتوں کو از سرِ نو پیدا کر دینا ناممکن ہے۔ اس زمانہ میں نہ شریعت کے ساتھ مزاجوں کو وہ مناسبت ہی ہو سکتی ہے جو اس عہدِ مبارک کے لوگوں کو تھی اور نہ آج اس اعلیٰ اخلاق ہی کو پیدا کیا جا سکتا ہے جو اس زمانہ میں صرف خاص خاص افراد ہی میں نہیں بلکہ ایک بہت بڑے طبقے میں موجود تھا اس وجہ سے یہ خیال کہ آج کے قاضی بھی اسی طرح پیش آنے والے معاملات میں حق کو متعین کر سکیں گے جس طرح حضرت معاذ بن جبلؓ اور قاضی شریحؒ کر لیتے تھے ایک غلط خیال ہے۔

پس قانون کو مدوّن کرنے سے مقصد شریعت کی وسعت کو تنگ کرنا اور تلاشِ حق کے مواقع کو ضائع کرنا نہیں ہے بلکہ علم و اخلاق کے زوال کی عام آفت کے سبب سے شریعت کی تنفیذ کے کام کو سہل بنانا ہے غور کیجئے تو یہ بعینہٖ وہی مقصد ہے جو اسلامی شریعت کی وسعت کے اندر مضمر ہے۔ اسلامی شریعت کی وسعت اس کے نفاذ کے کام کو سہل بناتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی تنفیذ کرنے والے اعلیٰ علم اور اعلیٰ اخلاق کے حامل ہوں۔ اگر ان دونوں چیزوں میں کمی ہو تو پھر شریعت کی تنفیذ کے نقطۂ نظر سے آسان راہ یہی ہے کہ قانون کو مدوّن کر کے اس کی وسعتوں کو سمیٹ دیا جائے تاکہ اس کو عملی زندگی پر منطبق کرنے والوں کو زیادہ الجھنیں نہ پیش آئیں اور وہ مختلف قسم کی ترغیبات کے شکار نہ ہوں۔

اتباعِ حق کے نقطۂ نظر سے بھی غور کیجئے تو یہی صورت زیادہ بہتر ہے۔ اگرچہ اس صورت میں اس کا امکان ہے کہ کوئی قاضی یہ محسوس کرے کہ ایک خاص معاملہ میں مدوّن قانون شریعت کے حقیقی منشا سے کچھ مختلف ہے۔ اور اس کو اس مدوّن قانون کی پابندی کے سبب سے ایک ایسا فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے جو اس کے خیال میں منشائے شریعت کے خلاف ہے۔ لیکن اسے سوچنا چاہیئے کہ یہ اس کی ایک انفرادی رائے ہے جو اس مدوّن ضابطہ کے مقابل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جس پر وقت کے ارباب حل و عقد کا اجماع ہے یا کم سے کم ان کی اکثریت اس کے شریعت سے اوفق ہونے پر مطمئن ہے

دوسرا شبہ یہ ہے کہ تدوین قانون کا کام بہرحال ایک چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں انجام پائیگا اسی کا انتخاب و اجتہاد ہوگا جس کو اس کام میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگی۔ تو کیا ایک چھوٹی سی جماعت کے مدوّن کئے ہوئے ضابطہ کو مسلمانوں کی ایک پوری قوم پر بلا امتیاز فرقہ و مذہب نافذ کر دینا از روئے شریعت صحیح ہوگا؟

یہ شبہ بھی بظاہر اپنے اندر اچھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ شبہ صرف آج ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی تدوینِ قانون کے خلاف پیش کیا جا چکا ہے۔ اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی اعتراض کے بنا پر تدوین قانون کی تجویزیں بعض مرتبہ رد بھی ہوئی ہیں۔

تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشہور ادیب ابن مُقفّع (متوفی ۱۴۳ھ) مترجم کلیلہ و دمنہ نے سلطان وقت

کے فقہی اختلافات سے متاثر ہو کر عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے سامنے قانون کو مدوّن کرنے کی ایک تجویز رکھی تھی۔ لیکن اسی شبہہ کی بنا پر جو اوپر مذکور ہوا ہے اس وقت کے علماء، اور فقہا اور ارباب کار نے ابن مقفع کی تجویز مسترد کر دی تھی۔

ہم یہاں ابن مقفع کی اصل تجویز اور اس کے متعلق علماء، وفقہا کا ردِ عمل نقل کرتے ہیں تاکہ زیرِ بحث شبہہ کا قابلِ توجہ پہلو بالکل سامنے آجائے۔

ابن مقفع نے جو تجویز پیش کی تھی اس کا ضروری حصہ خود اس کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"اور ان اسلامی ممالک سے متعلق امیر المومنین کو جس مسئلہ پر خاص طور پر غور کرنا ہے وہ یہ فقہی اختلافات کا مسئلہ ہے جواب اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل اگر امیر المومنین پسند فرمائیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ امیر المومنین ایک حکم جاری فرمائیں کہ تمام احکام اور فیصلے ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے امیر المومنین کی خدمت میں پیش کئے جائیں، اور ساتھ ہی ہر گروہ اپنے اپنے عقلی ونقلی دلائل بھی، جو وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اپنے پاس رکھتا ہے پیش کرے پھر امیر المومنین اس پورے ذخیرہ پر نظر ڈال کر ہر معاملہ میں اپنی رائے ظاہر فرما دیں اور پھر عدالتوں کو اس کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دیں۔ اس طرح وہ منتشر احکام اور فیصلے جو رطب ویابس ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل ہیں بالکل مدون ضابطہ کی شکل اختیار کر لیں گے اور غلط چیزوں سے یہ مجموعہ بالکل پاک ہوگا اس طرح توقع ہے کہ تمام بلادِ اسلامیہ ایک ہی ضابطۂ قانون کے تحت آجائیں گے اور اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی رائے اور فیصلہ پر تمام امت کو متفق کر دے گا۔"

یہ ابن مقفع کی تجویز تھی لیکن یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی اور اس کے کامیاب نہ ہو سکنے کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

وکان الباعث علی ذالک خوف الفقہاء و	اس کے کامیاب نہ ہونے کا سبب یہ ہوا کہ وقت کے
اُولِی الاُمرِ من ارتکاب الخطأ فی اجتہادہم	علماء اور ارباب کار اس بات سے ڈرے کہ مبادا وہ
فی شریعۃ حنیفۃ کالشریعۃ الاسلامیۃ	اسلامی شریعت جیسی الٰہی شریعت میں اجتہاد کی غلطیاں

اباوہم ان یتحملوا تبعة اجبار الناس علی تقلیدھم	کر بیٹھیں۔ بیزوہ اس بات کے لیے تیار نہ ہوئے کہ لوگوں کو اپنی تقلید پر مجبور کرنے کی ذمہ داری اٹھائیں۔

اسی ابوجعفر منصور کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ یہ جب ۱۴۸ھ میں حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالکؒ سے یہ خواہش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ تمام مسلمانوں کو امام موصوف کی فقہ پر مجتمع ہونے کے لیے تمام ممالک اسلامیہ میں حکم جاری کر دے۔ لیکن امام مالکؒ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہیں فرمایا اور کہا کہ:-

ان لکل قوم سلفا وائمة فان رأی امیر المؤمنین اعزہ اللہ نصرہ قرارھم علی حالہم فلیفعل	ہر گروہ کے اسلاف اور ائمہ الگ الگ ہیں۔ اس لئے اگر امیر المؤمنین ان کو موجودہ حال ہی پر چھوڑ دیں تو یہ بہتر ہے

ابوجعفر امام مالکؒ کے اس جواب کے بعد اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن اس خیال پر وہ برابر قائم رہا کہ امام مالکؒ کے ہاتھوں اسلامی قانون مدوّن ہو جائے۔ چنانچہ ۱۶۳ھ میں جب وہ پھر حج کے لئے گیا تو اس نے اپنی سابق تجویز امام صاحب کے سامنے نہایت تفصیل اور زور و قوت کے ساتھ رکھی۔ اور تدوین قانون سے متعلق اس نے اپنا نقطہ نظر بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں امام صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔

"اے ابوعبداللہ (امام مالکؒ کی کنیت ہے) آپ علم فقہ کو ہاتھ میں لیجئے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدوّن کر ڈالئے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعودؓ کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدوّن کیجئے جو خیر الامور اوسطہا کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو اگر آپ یہ خدمت انجام دے دیں تو ہم انشاء اللہ آپ کی فقہ پر مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے۔ اور اس کو تمام مملکت کے اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔"

کہا جاتا ہے کہ امام مالکؒ نے اس کی اسی خواہش کو پیش نظر رکھ کر موطا مرتب کی لیکن وہ اس

بات پر راضی نہ ہوئے کہ موطا کو پوری مملکت کے لئے اسلامی قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہی خواہش اپنے زمانہ میں ہارون الرشید نے بھی امام صاحب کے سامنے پیش کی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کی خواہش بھی مسترد کر دی۔

یہ تاریخی واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ جہاں تک قانون اسلامی کی تدوین کا تعلق ہے اس کی ضرورت، پوری شدت کے ساتھ عباسیوں کے زمانہ ہی میں محسوس کی گئی تھی۔ لیکن نہ تو اس عہد کے عام علماء نے اس کی ذمہ داری اٹھانا پسند کیا اور نہ امام مالکؒ جیسے جلیل القدر امام نے اس کو پسند فرمایا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز کو امام مالکؒ جیسے جلیل القدر امام نے خلیفہ وقت کے اتنے شدید اصرار کے باوجود پسند نہیں فرمایا آخر آج اس کو کس دلیل کی بنا پر مستحسن ٹھہرایا جا رہا ہے۔

ہمارے نزدیک ابن مقفع کی تجویز کی علماء کی طرف سے جو مخالفت کی گئی یا ابو جعفر منصور اور ہارون الرشید کی تجویزوں کو جو امام مالکؒ نے نہیں مانا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ تدوین قانون کا کام شریعت میں کوئی ناپسندیدہ کام ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں تجویزیں بالکل غلط صورت میں پیش کی گئی تھیں۔ اگر یہ تجویزیں جس شکل میں پیش ہوئی تھیں اسی شکل میں عمل جامہ پہن کر نافذ ہو گئی ہوتیں تو اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا بلکہ ملت اسلامیہ ایک شدید فتنہ میں مبتلا ہو جاتی۔ اس عہد کے حالات کچھ ایسے تھے کہ کوشش کے بعد بھی اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ یہ تجویزیں صحیح صورت میں بروئے کار آ سکیں اس لئے جو کچھ ہوا بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے۔ جنہوں نے حسن تدبیر سے کام لے کر اس فتنے کو دبا دیا اور ایک غلط نظیر قائم نہ ہونے پائی۔

ابن مقفع نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں صریح غلطی یہ تھی کہ اس نے تصویب و تردید اور اجتہاد و انتخاب کا پورا حق ابو جعفر منصور کو دے دیا تھا۔ وہ جس بات پر صاد کر دیتا وہ شریعت کا قانون بن جاتی اور جس بات کو رد کر دیتا وہ شریعت سے خارج ہو جاتی۔ ابو جعفر منصور علم و تقویٰ کے اعتبار سے نہ تو اس ذمہ داری کا اہل ہی تھا اور نہ شریعت نے کسی ایک شخص کو یہ حق ہی بخشا ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے شریعت بنائے اور جس چیز کو چاہے شریعت سے خارج کر دے۔ یہ کام امت کے ارباب حل و عقد اور اصحاب تفقہ و اجتہاد کے مل کر کرنے کا تھا۔ اور وہی از روئے شرع اس کے انجام دینے کے مجاز تھے۔ لیکن ابو جعفر منصور

جیسے مستبد کے آگے نہ تو ابن مقفع ہی ایک اسمبلی یا کونسل کے قیام کی تجویز لانے کی جرأت کرسکتا تھا۔ اور نہ وقت کے علماء ہی یہ توقع کرسکتے تھے کہ وہ ابوجعفر منصور کو یہ شکل تسلیم کرنے پر آمادہ کرسکیں گے۔ اس لئے انہوں نے سلامتی اس میں دیکھی ہوگی کہ کسی طرح یہ بات ٹل جائے چنانچہ یہ کہ کر انہوں نے اس تجویز سے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ اجتہاد بہت بڑی ذمہ داری ہے اور ہم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اپنا اجتہاد دوسروں پر لازم کریں۔

اسی طرح ابوجعفر منصور نے امام مالکؒ کے سامنے جو تجویز رکھی تھی وہ بھی بالکل غلط تھی۔ اس صورت میں اجتہاد و انتخاب کی تمام ذمہ داری تنہا امام صاحب پر عائد ہوتی تھی۔ وہ جس شکل میں قانون کو مدون کر دیتے خلیفہ کے حکم سے وہ مدون قانون پوری مملکت میں جاری ہو جاتا اور اس کے سارے عذاب و ثواب کے ذمہ دار خلق اور خالق کے نزدیک تنہا امام صاحب ہوتے۔ بھلا اتنی بڑی ذمہ داری امام صاحب اپنے کندھوں پر کس طرح لے سکتے تھے؟ اس کی صحیح شکل از روئے شریعت یہ تھی کہ ملک کے اہل علم و تفقہ اجتماعی طور پر مل کر اس قانون کو مدون کرتے اور پھر ملک کے ارباب حل و عقد اپنی تصویب و تائید سے اس کو جاری و نافذ کرتے۔ اگر یہ شکل موجود ہوتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ امام صاحب اس ذمہ داری سے کتراتے۔ لیکن نہ تو ارباب حل و عقد پر مشتمل کوئی شوریٰ موجود تھی نہ ارباب تفقہ و اجتہاد کی کوئی تنظیم ہی موجود تھی جو شرعی امور میں کوئی رائے دے سکتی اور نہ خود خلیفہ صاحب علم اور صاحب فتویٰ تھا۔ تو ایسی شکل میں امام صاحب یہ کس طرح کرسکتے تھے کہ وہ صرف اپنی ذمہ داری پر قانون مدون کر کے دے دیں کہ ابوجعفر منصور اپنے اقتدار کے بل پر مسلمانوں پر اس کو مسلط کر دے؟ اس لئے امام نے اس کے بار بار کے اصرار کے باوجود اس خدمت سے معافی چاہی۔[1]

بہرحال ابن مقفع کی تجویز کے رد ہونے یا امام مالکؒ صاحب کے تدوین قانون کے کام پر راضی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ یہ کام شریعت کی رو سے ناجائز تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام

[1] علاوہ بریں یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ جس طرح حجاز میں امام مالکؒ فقہ و اجتہاد کے امام مانے جاتے تھے اسی طرح عراق اور ممالک مشرقیہ میں امام ابوحنیفہ، شام میں اوزاعی اور مصر میں لیث بن سعد کے مدرسۂ فکر کا غلبہ تھا۔ اس صورت میں خلیفۂ وقت کے لیے یہ کیسے جائز ہوسکتا تھا کہ دوسرے مذاہب فکر کو دبا کر زبردستی امام مالکؒ کی فقہ کو ساری مملکت کا قانون بنا ڈالتا۔ اس زیادتی کو امام مالکؒ کی انصاف پسندی نے گوارا نہ کیا۔

کے کرنے کا ایک خاص ضابطہ ہے جس کا اہتمام ضروری ہے۔ اس ضابطے سے منحرف ہو کر اس کام کو کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لینا ہے جس کے لئے کوئی خدا ترس آدمی تیار نہیں ہو سکتا چونکہ بظاہر اس کا امکان نہیں تھا کہ یہ کام اپنے ضابطے کے مطابق ہو سکے گا اس لئے نہ تو حضرت امام مالکؒ نے ابو جعفر منصور کی تجویز قبول فرمائی اور نہ علماء نے ابن مقفع کی تجویز کی تائید فرمائی۔ رہی یہ بات کہ یہ ضابطہ کیا ہے تو یہ بات آگے کے مباحث سے آپ سے آپ واضح ہو جائے گی۔

۳۔ تیسرا شبہ بالعموم اقلیت والے فقہی مذاہب کے پیروؤں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے ان کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ مدون قانون لازماً کسی ایک فقہ پر مبنی ہو گا اور ناگزیر ہے کہ یہ فقہ اس گروہ کی ہو جو اس ملک کے اندر اکثریت رکھتا ہے اس سے ان کو بجا طور پر یہ ڈر پیدا ہوتا ہے کہ ان کو ایک ایسے قانون کی اطاعت کرنی پڑے گی جو ان کی اپنی فقہ پر مبنی نہیں ہو گا۔

اس شبہ کو دو باتوں سے تقویت پہنچتی ہے ایک تو یہ کہ عموماً تدوین قانون کا رجحان الگ الگ فرقوں اور گروہوں کی آزادی کے منافی خیال کیا گیا ہے چنانچہ امریکہ اور انگلستان میں تدوین قانون کی تحریک کے زور نہ پکڑنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہاں مختلف فرقے اور گروہ موجود ہیں جو اس بات کو ترجیح دیتے رہے ہیں کہ قانون کو تدوین کی جکڑبندیوں میں لانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو عُرف و رواج پر باقی رہنے دیا جائے۔ اس میں ہر فرقہ اپنے لئے فی الجملہ آزادی محسوس کرتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں بھی قانون کو مدون کرنے کے بجائے اگر اس کو کتاب و سنت اور اجماع پر چھوڑ دیا جائے تو خیال ہے کہ تدوین کے مقابل میں اس صورت کو اقلیت والے فقہی مذاہب زیادہ پسند کریں گے۔

دوسری بات اس کی تائید میں یہ کہی جا سکتی ہے کہ اب تک تدوین قانون کی جو مثالیں مسلمانوں کے یہاں ملتی ہیں وہ سب کی سب اس بات کی شاہد ہیں کہ ملک کی اکثریت کا جو فقہی مذہب رہا ہے اسی مذہب کے مطابق قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ نہیں ہوا کہ کتاب و سنت اور اجماع کو اساس قرار دے کر اس بات کی کوشش کی جاتی کہ فقہ اسلامی کے پورے ذخیرہ میں سے وہ مسائل اخذ کر لیے جاتے جو کتاب و سنت سے زیادہ اوفق نظر آتے ہیں۔ اس بنا پر بعضوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آج بھی

تدوین قانون کی نوبت آئی تو یہی ہوگا۔

ان شبہات اور اندیشوں سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں:

پہلی یہ کہ جہاں تک اہل سنت کے مختلف فقہی مذاہب کا تعلق ہے ان کے درمیان جو اختلاف ہے، وہ جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے[1]، اصول کا اختلاف نہیں ہے بلکہ محض تاویل اور اجتہاد کا اختلاف ہے۔ تاویل اور اجتہاد کا اختلاف کوئی ایمان اور عقیدے کا معاملہ نہیں ہوا کرتا کہ اس کے خلاف کوئی بات اختیار ہی نہ کی جا سکے۔ بلکہ یہاں سوال صرف ترجیح کا ہوتا ہے۔ آپ کسی پہلو کو ترجیح دیتے ہیں دوسرا کسی پہلو کو ترجیح دیتا ہے۔ محض اتنی سی بات کے لیے کسی گروہ کا اپنی بات پر اڑتا اور وہ بھی اس حد تک کہ اس کے سبب سے نفس اسلامی قانون کے نفاذ ہی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ کسی طرح بھی قرین عقل و دیانت نہیں ہے۔ رہے اہل سنت اور شیعہ حضرات کے اختلافات تو وہ صرف فقہ تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ عقائد اور دستوری مسائل تک بھی ان کی زد میں آ گئے ہیں۔ اب اگر مسلمان ملکوں میں اسلامی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوتی ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ اصول اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جہاں شیعوں کی اکثریت ہے وہاں دستور اور ملکی قانون شیعی مسلک پر بنے اور سنیوں کو آئینی تحفظات دیئے جائیں اور اسی طرح اس کے برعکس۔

دوسری یہ کہ حکومت کا تعلق زیادہ تر دین کے اس حصے سے ہوتا ہے جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ بقیہ چیزیں حکومت سے براہ راست تعلق رکھنے والی نہیں ہوا کرتیں۔ دین کے اس حصے میں اول تو فقہی اختلافات نسبتۃً کم ہیں۔ ثانیاً جو مسائل عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں ان میں محض ٹیکنیکل وجوہ پر اگر کوئی شخص اپنی بات کی پچ کرنا چاہے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ اس طرح کے معاملات میں اصلی فیصلہ کن عامل کسی چیز کا عملی پہلو ہوا کرتا ہے۔ عملی زندگی کے تجربات خود انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہیں کہ کسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں میں سے کون سا پہلو اختیار اور ترجیح کے لائق ہے اور اس اشارہ کو مشکل ہی سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ فقہ حنفی کے کتنے مسائل ہیں جن میں متقدمین کا مسلک کچھ اور تھا لیکن متاخرین

---

[1] : ملاحظہ ہو "اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات اور ان کا حل" از امین احسن اصلاحی

نے کچھ اور اختیار کیا۔ ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ متاخرین نے اپنے امام کے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے اماموں کے مسلک کے مطابق فتویٰ دے دیا۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ جن ملکوں کی عظیم اکثریت شافعی المذہب تھی، انہوں نے خود اپنے اختیار سے اپنے پرسنل لا کو فقہ حنفی کے مطابق مدوّن کرایا اور اس کو نافذ کیا۔ ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شخصی زندگی کے معاملات میں تعصب اور تقلید جامد کے رویے پر زیادہ عرصہ تک اصرار ممکن نہیں ہے بلکہ تجربات خود اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو سوسائٹی ایک مدت دراز تک ریاست کی عملی ذمہ داریوں سے بیگانہ رہی ہے اس کے اندر سے تقلید جامد اور تعصب کو دور ہونے کچھ نہ کچھ دیر لگے گی اور اس معاملے میں بہرحال صبر سے کام لینا پڑے گا۔

تیسری یہ کہ صحیح تدوینِ قانون تو اسی وقت ہو سکے گی جبکہ اس تدوین کے ذمہ دار اصحاب کا نقطۂ نظر فقہی مسائل میں وسیع ہو۔ اور وہ ایک مذہب کے تمام مسائل کی پیروی پر اصرار کرنے کے بجائے تمام مذاہب فقہیہ سے استفادہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہمارے اہل علم کو ایک آزاد اسٹیٹ کی قانونی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داریاں سنبھالتے ایک عرصہ لگ جائے اور جب تک کہ ہمارے ہاں تعلیم فقہ کا طریقہ نہ بدل جائے اس وقت تک ہمیں اس پر قناعت کرنی پڑے گی کہ ہمارے ہاں شرعی قانون جس طرح بھی ہو ایک دفعہ مدوّن ہو کر رائج ہو جائے۔

۴۔ چوتھا شبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہاں تدوین قانون کی کوئی قابلِ ذکر مثال نہیں ملتی اس وجہ سے یہ ایک بالکل نئی بات ہے۔

ہمارے نزدیک اس شبہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہماری تاریخ کے مختلف زمانوں میں قانون اسلامی کو مدوّن کرنے کی چھوٹی بڑی کوششیں عمل میں آتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے صحابہؓ نے قرآن مجید کو جمع کیا اور حضرت عثمانؓ نے ۳۰ھ میں اس کی نقلیں مختلف اسلامی ملکوں کو بھجوائیں۔ اس کے بعد جستہ جستہ حدیثوں کی صورت میں اسلامی قانون کے مختلف ابواب جمع کئے جانے لگے یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزمؒ کو باقاعدہ احادیث کے مدوّن کرنے کا حکم دیا۔

اس وقت تک فقہی اختلافات بہت زیادہ بڑھے نہیں تھے اس وجہ سے فقہی مسائل کی تدوین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن جونہی یہ اختلافات بڑھے فوراً ان کی تدوین کی طرف لوگوں کو توجہ ہوئی چنانچہ ابن مقفع نے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ابوجعفر منصور کو اس چیز کی طرف توجہ دلائی اور پھر یکے بعد دیگرے ابو جعفر منصور اور ہارون الرشید نے اس کے لیے حضرت امام مالکؒ پر زور ڈالا اور امام صاحب نے غالباً جیسز کو پیش نظر رکھ کر موطا لکھی بھی۔ لیکن اس بات کو انہوں نے پسند نہیں فرمایا کہ تنہا ان کے مدون کیے ہوئے قانون کو پورے ملک کا قانون بنا دیا جائے۔ اگر نظام خلافت شورائی ہوتا اور تدوین قانون کے کام کو صحیح طریقہ پر ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں انجام دلایا گیا ہوتا جو تفقہ اور اجتہاد کے پہلو سے تمام مسلمانوں کے نزدیک معتمد ہوتی اور امام صاحبؒ کو یہ اعتماد ہوتا کہ اس کا نفاذ ارباب حل و عقد کی تصویب و تائید سے ہوگا، نہ کہ محض خلیفہ کے حکم سے، تو غالباً یہ کام حضرت امام مالکؒ کی رہنمائی میں اسی زمانہ میں انجام پا گیا ہوتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، اس کو جس شکل میں امام صاحب کے سامنے رکھا گیا تھا وہ شکل ایسی نہ تھی کہ اس کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے سکتے۔

اس کے بعد تدوین کی ایک نمایاں کوشش گیارھویں صدی ہجری میں سلطان محمد اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے عمل میں آئی۔ سلطان موصوف نے علماء کی ایک کمیٹی بنائی اور ان کو ایک ایسی کتاب مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی جو ایسے فتووں پر مشتمل ہو جن پر جید فقہاء نے اتفاق کیا ہو اور جس میں ایسے نوادر جمع کیے جائیں جن کو ماہر علماء نے اختیار کیا ہو۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق مشہور کتاب فتاوائے عالمگیری کی ترتیب عمل میں آئی۔

یہ کتاب چھ جلدوں میں ایک ضخیم کتاب ہے۔ جس طرح فقہ کی دوسری کتابوں میں عبادات و معاملات کا بیان ہوتا ہے اسی طرح اس کتاب میں بھی عبادات و معاملات کی تفصیل ہے۔ اگرچہ شروع سے اس کتاب کو فقہ حنفی میں ایک نہایت اہم مرجع کی حیثیت حاصل ہے لیکن نہ تو اس کی تدوین اس طریقہ پر ہوئی ہے جس طریقہ پر اس زمانہ میں قوانین مدون ہوتے ہیں اور نہ باضابطہ سرکاری طور پر کبھی ضابطۂ قانون کی حیثیت سے اس کا نفاذ عمل میں آیا۔

اس کے بعد تدوین قانون کی ایک قابل ذکر کوشش دولت عثمانیہ نے کی۔ حکومت نے سات علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور ان کے سامنے یہ کام رکھا کہ۔

"فقہی معاملات پر مشتمل ایک ایسی کتاب تالیف کی جائے جو ضابطہ کی صورت میں منضبط ہو۔ جس سے فایدہ اٹھانا نہایت آسان ہو۔ جو اختلافات سے پاک ہو۔ جو تمام مختار اقوال پر حاوی ہو۔ جس کی مراجعت ہر شخص کے لیے آسان ہو"

اس کمیٹی نے تدوین قانون کی ضرورت سے متعلق محرم سنہ ۱۲۸۶ھ ہجری (مطابق ۱۸۶۹ء) میں صدر اعظم عالی پاشا کی خدمت میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں تدوین قانون کی ضرورت مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کی گئی تھی۔

"علم فقہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ جس کی وسعت کے سبب سے مشکلات کے حل کے لیے ضروری مسائل کا نکالنا بڑی مہارت اور بڑے ملکہ کا تقاضا کرتا ہے۔ خصوصاً فقہ حنفی کی وسعتوں کی تو کوئی حد ہی نہیں رہی ہے۔ اس کے اندر ہر دور میں بڑے بڑے مجتہدین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس میں بہت سے اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ اور چونکہ فقہ شافعی کی طرح فقہ حنفی کی تنقیح نہیں ہو سکی۔ اس وجہ سے یہ اختلافات جوں کے توں پڑے رہ گئے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اختلافات اور تناقضات کے اندر سے صحیح بات کو منقح کر کے نکالنا اور اس کو حالات زمانہ پر منطبق کرنا نہایت مشکل کام بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جو مسائل رواج اور عادت پر مبنی ہوتے ہیں وہ زمانہ کے تغیر سے بدلتے بھی رہتے ہیں"۔

مذکورۂ بالا مقصد سامنے رکھ کر کمیٹی نے تدوین قانون کا کام شروع کیا جو ۱۲۹۳ ہجری (۱۸۷۶ء) میں انجام کو پہنچا اور مجلۃ احکام عدلیہ کے نام سے سلطان کی جانب سے اس کے نفاذ کا اعلان ہوا۔

مجلۃ الاحکام کی نوعیت سے فی الجملہ آشنا کرنے کے لیے نامناسب نہ ہوگا اگر ہم مختصراً اس کے بعض پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کر دیں۔

مجلۃ الاحکام کل ۱۸۵۱ دفعات پر مشتمل ہے جو ایک مقدمہ اور ۱۶ ابواب میں پھیلی ہوئی ہیں۔

مقدمہ میں سو دفعات ہیں جن میں فقہ کی تعریف و تقسیم بیان کرنے کے بعد اس کے کلیات اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اس میں بالترتیب مندرجۂ ذیل ابواب آتے ہیں۔

کتاب البیوع۔ کتاب الاجارات۔ کتاب الکفالۃ ۔ کتاب الحوالۃ۔ کتاب الرہن۔ کتاب الامانات ۔ کتاب الہبۃ۔ کتاب الغصب و الاتلاف۔ کتاب الحجر و الاکراہ۔ کتاب الشفعۃ۔ کتاب الشرکات۔ کتاب الوکالۃ۔ کتاب الصلح و الابراء۔ کتاب الاقرار۔ کتاب الدعویٰ۔ کتاب البینات والتحلیف۔ کتاب القضاء۔

مجلّے کا عام ماخذ فقہ حنفی کی مشہور اور متفق علیہ کتابیں ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے کئی قول منقول ہوتے ہیں تو مجلّے میں اس قول کو لیا گیا ہے جو ضروریات زمانہ اور مصلحت عامہ کے موافق نظر آیا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر نہ صرف امام محمدؒ اور قاضی ابویوسفؒ کے اقوال کو بعض جگہ امام صاحب کے اقوال پر ترجیح دی گئی ہے بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کہیں کہیں متاخرین کے اقوال کو متقدمین کے اقوال پر ترجیح دے دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اقوال اگر مذہب شافعی کے موافق ہوتے ہیں جب بھی ان کے اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی گئی ہے۔

مجلّے کے مذکورہ ابواب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاوائے عالمگیری اور فقہ حنفی کی دوسری جامع کتابوں کے برعکس مجلّے میں عبادات اور تعزیرات کا حصہ نہیں ہے۔ نیز وہ قوانین بھی اس میں نہیں لیے گئے ہیں جو پرسنل لا سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مثلاً نکاح، طلاق، نفقہ، نسب، ولایت، وصیت اور پرورش، رضاعت وغیرہ۔ علاوہ ازیں وراثت، مفقود، الحجر اور اوقاف وغیرہ کے احکام بھی اس میں نہیں ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اس کام کو بتدریج کرنا پسند کیا گیا ہو۔ اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حکومت نے ۱۹۱۷ء میں ایک قانون نکاح و طلاق سے متعلق قانون عائلی کے نام سے جاری کیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ اصلاً تو یہ بھی فقہ حنفی پر مبنی تھا جس کو سرکاری مذہب ہونے کی حیثیت حاصل تھی لیکن اس میں بہت کچھ دوسری اسلامی فقہوں سے بھی لیا گیا تھا۔ تاکہ اس کو ضروریات زمانہ کے مطابق بنایا جا سکے۔

جس زمانے میں مجلّے کی تدوین ہوئی ہے اس زمانہ میں تقریباً تمام عرب ممالک میں تدوین قانون کا رجحان نہایت شدت سے پایا جا رہا تھا اس وجہ سے مجلّے کو نہ صرف ٹرکی میں نافذ کیا گیا بلکہ ان تمام ممالک میں اس کو قبول کر لیا گیا جو ترکوں کے زیر اقتدار تھے۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے بعد تک یہ ان تمام ملکوں میں نافذ العمل رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے ٹرکی میں اس کو ختم کر کے اس کی جگہ سوئٹزرلینڈ اور جرمنی و اٹلی کے قوانین کو دے دی گئی۔ پھر بتدریج اس کو لبنان اور البانیہ میں ختم کیا گیا۔ لیکن اب بھی فلسطین، عراق، شام اور شرق اردن میں اس کے اثرات کچھ نہ کچھ باقی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں عراق میں بھی ضابطہ دیوانی کو فقہ اسلامی کی بنیادوں پر مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بٹھائی گئی تھی لیکن اس کی کوششوں کی تفصیل ہمیں نہیں معلوم ہو سکی۔ اس کمیٹی کے پیش نظر ضابطہ دیوانی کو اس طرح مرتب کرنا تھا کہ اسلام اور عصر حاضر دونوں کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ اس کمیٹی نے مصر کے ایک مشہور ماہر قانون کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور اس نے ۱۹۴۲ء میں اپنا کام پورا بھی کر لیا تھا، لیکن بعد کے مراحل میں کیا صورت پیش آئی اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مصر ابتدا سے شافعی المذہب مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اس وجہ سے دولت اسماعیلیہ کے زمانہ تک وہاں مذہب شافعی کا دور دورہ رہا۔ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ کچھ اسی سے ملتی جلتی حالت وہاں دولت ایوبیہ کے زمانہ میں بھی قائم رہی۔ البتہ ترکوں کے اقتدار کے بعد وہاں مذہب شافعی کی جگہ عدالتوں میں فقہ حنفی کا دور دورہ ہوا اور ایک حد تک یہی صورت حال وہاں اب بھی باقی ہے۔

قانون کو مدون کرنے کی کوششیں تو مصر میں ترکوں کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکی تھیں لیکن چونکہ ان میں سے کوئی کوشش خالص اسلامی بنیادوں پر عمل میں نہیں آئی ہے اس وجہ سے ان کا ذکر یہاں بے محل ہوگا۔ صرف ایک کوشش اس مقام پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ حکومت مصر کے حکم سے محمد قدری پاشا مرحوم نے مسلمانوں کے پرسنل لا سے متعلق قوانین فقہ حنفی کی بنیاد پر مدون کیے۔ یہ

ضابطہ کل ۷،۴ دفعات پر مشتمل ہے اور اس میں نکاح، طلاق، نسب، ولایت، ہبہ، میراث اور وصیت وغیرہ کے قوانین جمع کیے گئے ہیں۔ مصری عدالتوں میں اسی ضابطے کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اس دور آخر میں ایک کمیٹی شیخ مراغی مرحوم کی صدارت میں قائم ہوئی تھی جس کے ارکان میں مفتی مصر شیخ عبد المجید سلیم اور مصر کے چیف جسٹس شیخ فتح اللہ سلیمان بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لا سے متعلق قوانین نئے طریقے پر مرتب کرے اور اس میں کسی ایک متعین فقہ کی تقلید کے بجائے اسلام کے تمام فقہی مذاہب سے فائدہ اٹھائے۔ یہ کمیٹی ہمارے نزدیک صحیح اصول پر ایک صحیح مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن ہمیں اس کے کاموں کی تفصیلات کی بابت کچھ علم نہیں کہ یہ کچھ کام کر سکی یا نہیں اور اگر کر سکی تو کس حد تک، اور اس کے نتائج کیا نکلے؟

جس طرح ہمارے یہاں اس وقت حامیان شریعت اور مخالفین شریعت کے درمیان ایک کشمکش سی برپا ہے اسی طرح مصر میں بھی تدوینِ قانون سے متعلق حامیان شریعت اور مخالفین شریعت میں ایک سخت کشمکش برپا ہے۔ مخالفین شریعت یہ چاہتے ہیں کہ قانون کی تدوین ہو یا قانون کا بنانا، یہ دونوں کام جدید طرز پر شریعت سے بالکل بے نیاز ہو کر کیے جائیں۔ شریعت کو ان چیزوں میں مداخلت کرنے کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ اس کے برعکس حامیان شریعت یہ کہتے ہیں کہ قانون کی تدوین تو بے شبہ نئے طریقوں پر عمل میں آئے، تاکہ ہمارا مدون کیا ہوا ضابطہ نئے عصری تقاضوں کے مطابق ہو، لیکن جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے اس کی اساس سو فیصدی اسلامی شریعت پر ہو، کیونکہ اسلامی شریعت کے سوا کوئی اور شریعت ہمارے قانون کی اساس نہیں بن سکتی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ مصر میں وطنیت کا جذبہ ایک ہی ساتھ ان دونوں رجحانات کی حمایت کر رہا ہے۔ دین کی مخالفت بھی وطنیت ہی کے جذبہ کے تحت ہو رہی ہے اور اس کی تائید میں بھی اب یہی جذبہ زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہی صورت حال وہاں عرصہ سے نظر آ رہی ہے۔ خدیو اسمٰعیل پاشا نے ترکوں کے بنائے ہوئے مجلۂ احکام کو محض اس بنیاد پر رد کر دیا تھا کہ وہ ترکوں کے اثر و اقتدار کی یادگار ہے۔ اس کا قومی تعصب اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ ترکوں کے ہاتھ سے کسی چیز کو

قبول کرے اگرچہ وہ دین ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے مجلہ کو اپنانے کے بجائے شیخ مخلوف منیاوی کو مامور کیا کہ وہ نپولین کے قانون اور امام مالک کے قانون میں تطبیق دے کر مصر کے لیے ایک نیا ضابطہ مدون کریں۔ چنانچہ شیخ منیاوی نے محنت شاقہ کر کے ایک ضابطہ مدون بھی کیا، لیکن مصر کے ہر حلقے اس کی مخالفت ہوئی اور مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ غیر ملکی ہے۔ یعنی مخالفت کرنے والوں کی نظر میں اس کی اصلی خرابی یہ نہیں تھی کہ وہ خلافِ شریعت ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ ایک غیر ملک سے برآمد کیا گیا ہے۔ انہی شیخ منیاوی کے جواب میں مرحوم قدری پاشا نے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ایک ضابطہ حنفی فقہ کی اساس پر مدون کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہماری تمام عصری ضروریات اسلامی شریعت سے پوری ہو سکتی ہیں، اس وجہ سے ہمیں کسی غیر ملکی قانون کے منت کش ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت وطنیت کے جذبہ کو مصر میں جس طرح اسلامی شریعت کی حمایت میں استعمال کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ شیخ محمد سلیمان نائب محکمۂ شرعیہ عالیہ، شیخ احمد محمد شاکر اور سید محب الدین خطیب وغیرہ جیسے علماء کی ان تحریروں سے ہوتا ہے جو انہوں نے غیر اسلامی قوانین کے مقابلہ میں اسلامی شریعت کی حمایت میں لکھی ہیں۔

ان علماء کا اسلامی شریعت کی حمایت میں عام طرزِ استدلال یہ ہے کہ ہماری وطن پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسلامی شریعت ہی کو اپنی قانون سازی کی اساس قرار دیں، کیونکہ اسلامی شریعت کے ماسوا دوسرے تمام قوانین ہمارے ملک اور ہماری قوم کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ اسلامی شریعت ہی ہے جو ۱۳ سو سال سے ہمارے ملک پر حکمران رہی ہے۔ اسلامی شریعت ہی ہے جو ہماری وطنی عزت، ہماری زبان، ہمارے مذہب اور ہمارے کلچر کی صدیوں سے محافظ ہے۔ اسی کے اندر وہ خزانے ہیں جو موجودہ تہذیب و تمدن اور موجودہ قومی ترقیوں کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ اسی کے اندر وہ چیز موجود ہے جو ہمیں مغرب کی غلامی سے چھڑا سکتی ہے اور مصر کو تمام مشرق کی امامت کا درجہ دلا سکتی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تنہا یہی چیز ہے جو ہمارے عوام اور ہماری حکومت کے درمیان وہ صحیح موافقت

اور حقیقی تعاون پیدا کر سکتی ہے جس کے بغیر دنیا میں کوئی قانون سازی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ان تمام تفصیلات سے جو اوپر ہم نے پیش کی ہیں یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تدوین قانون کا تخیل مسلمانوں میں کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ یورپ میں اس تخیل کے جنم لینے سے بہت پہلے مسلمانوں کے اندر یہ تخیل پیدا ہوا۔ یورپ میں تدوین قانون کی ابتدا جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے نپولین سے ہوئی ہے، لیکن اسلام میں اس کی ضرورت سب سے پہلے ابوجعفر منصور نے امام مالکؒ کے سامنے پیش کی تھی۔ اور یہ تخیل صرف تخیل ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ واقعات کی شہادت سے یہ ثابت ہے کہ تاریخ کے تقریباً ہر دور میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام بھی ہوا ہے۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کام اس حد تک نہیں ہو سکا جس حد تک اس کو ہونا چاہیے اور نہ اس طرح ہو سکا جس طرح اس کا ہونا مطلوب تھا۔

تدوین قانون کا صحیح طریقہ | اوپر کے مباحث سے جو حقیقت نہایت واضح ہو کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اب تک مسلمانوں نے تدوین کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے بیشتر اس کی نوعیت یہ رہی ہے کہ فقہ حنفی کو سامنے رکھ کر اسی کے جھول جھال درست کر کے اس کو منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں جہاں یہ کام ہوا ہے وہاں کے حکمران بھی اسی فقہ کے پیرو تھے۔ اور وہاں کے عوام کی اکثریت بھی اسی فقہ کی مقلد تھی۔ ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں ناگزیر تھا کہ اس کام میں فقہ حنفی ہی کو ترجیح و تقدم حاصل ہو۔ یہ طریق کار، اگرچہ اس پہلو سے صحیح ہے کہ ملک کے عوام کی اکثریت اس سے مطمئن ہوتی ہے، لیکن اس میں چند خرابیاں ایسی ہیں جو ناقابل لحاظ نہیں کہی جا سکتیں۔

اس میں پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ طریقہ اختیار کر کے اتباع کتاب و سنت کا حق جو ایک مسلمان پر سب سے بڑا حق ہے، پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اجتہادی مسائل میں ہم کو کسی متعین فقہ کی تقلید کے بجائے اوفق بالکتاب والسنۃ بات کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اور یہ چیز صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم کسی متعین فقہ کی تقلید کے بجائے ہر امر میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اس کے بارے میں فقہاء و مجتہدین کے جو اقوال منقول ہیں ان میں سے کتاب و سنت

سے قریب تر قول کون سا ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ طریقہ اختیار کر کے وہ عصری تقاضے کما حقہ پورے نہیں کیے جا سکتے جو تدوین قانون سے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری فقہ اسلامی بحیثیت مجموعی تو بلاشبہ ان تمام اجتماعی و سیاسی اور تمدنی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے جن سے آج ہم دوچار ہیں، لیکن یہ دعویٰ ہم اپنی مختلف فقہوں میں سے کسی ایک مخصوص فقہ کے بارہ میں مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔

چنانچہ غالباً یہی وجہ ہے کہ ترکوں نے جو مجلۃ احکام تیار کرایا وہ زیادہ عرصہ تک عصری تقاضوں کو پورا نہ کر سکا بلکہ بہت جلد اس میں ترمیمات کی نوبت آ گئی یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس کا ہیولیٰ ہی بدل گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر صرف فقہ حنفی پر مبنی ہونے کے بجائے وہ پوری فقہ اسلامی کو پیش نظر رکھ کر مدون کیا گیا ہوتا تو وہ عصری تقاضوں کے مقابلہ میں نہایت مستحکم ثابت ہوتا اور اگر اس میں کوئی کمی محسوس ہوتی بھی تو بڑی آسانی سے اس کی تلافی فقہ اسلامی کے اندر ہی سے مواد حاصل کر کے کی جا سکتی تھی۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ ملک کے اندر جن مذاہب کے پیرو اقلیت میں ہوتے ہیں وہ اس سے ایک قسم کی بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے تمام گروہوں کے اندر کتاب و سنت کی حیثیت ایک جامع کی ہے اس وجہ سے ان دونوں چیزوں کے بارہ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ ان پر متفق ہیں۔ اسی طرح وہ کسی ایسے مدون ضابطہ پر بھی آسانی سے متفق ہو سکتے ہیں جو پوری فقہ اسلامی سے اخذ اور کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر مرتب کیا گیا ہو۔ لیکن اگر وہ یہ محسوس کریں کہ کسی خاص گروہ کی فقہ ان کے اوپر لادی جا رہی ہے تو اس چیز سے ان کے اندر بے چینی پیدا ہوگی اور ان کی یہ بے چینی بالکل قدرتی ہوگی۔

ان تمام خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ مدونین قانون اپنے سامنے کسی ایک ہی معین فقہ کو سامنے نہ رکھیں بلکہ پوری فقہ اسلامی کو سامنے رکھ کر ہر اجتہادی مسئلے میں یہ دیکھیں کہ کونسی بات کتاب و سنت کے فحویٰ اور مقتضیٰ سے زیادہ لگتی ہوئی ہے، اور جو بات اس پہلو سے زیادہ قوی نظر آئے اس کو اختیار کر لیں خواہ اس کا تعلق ہماری مختلف فقہوں میں سے جس فقہ سے بھی ہو۔ باقی صفحہ ۳۲۵ پر